⊙ پیر ولایت علی شاہ

پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ اردو، سرگودھا یونیورسٹی، سرگودھا

# پروفیسر عنایت علی خان کا عصری شعور

## (ظریفانہ شاعری کے تناظر میں)

**Abstract**:

Professor Inayat Ali khan is a renowned Urdu comic poet of Modern era. He has portrayed the spectrum of life in such a manner that it emerges as the factor responsible for entertainment for its readers. He has entertained various social and theoretical subjects in his comic poetry. This element lifts his comic poetry from mere comedy to a thoughtful and witty piece of literature. This article is a study of social aspects in the comic poetry of professor Inayat Ali Khan.

**Keywords**:

Comic Poetry, Zeitgeist, Representation of Social life

مزاح نگار اور طنز نگار سماجی ناہمواریوں اور منفی رویوں کو حساس ذہن سے محسوس کر کے اس کا ادراک کرتا ہے لیکن ان کے اظہار کے لیے اسے لطیف پیرایہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ مزاح جیسی شائستہ صنف لطیف پیرائے کی متقاضی ہوتی ہے۔ یوں طنز و مزاح نگار ایک طرف تو ایسے سرجن کا روپ دھارے ہوتا ہے جس کے سامنے منفی سماجی رویے ہوتے ہیں اور وہ ان سے قوم کو چھٹکارا دلانے کے لیے ایک طرف طنز کے نشتر استعمال کرتا ہے تو دوسری طرف اس کا انداز بیان ایسا ہوتا ہے کہ سماج سسکنے اور تڑپنے کی بجائے تبسم زیرِ لب کی کیفیت میں مبتلا ہو جائے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ طنزیہ اور ظریفانہ شاعری خاصا محنت طلب کام ہے۔ ظریفانہ شاعری میں شاعر کو سماجی رویوں اور منافقتوں کو لطیف انداز میں قارئین اور سامعین کے سامنے پیش کرنا پڑتا ہے۔

اردو کی ظریفانہ شاعری کے مختلف ادوار میں فکری و موضوعاتی اور فنی حوالے سے متنوع رجحانات سامنے آتے رہے ہیں۔ ہر دور کے شعرا نے اپنے عہد کے سیاسی، سماجی اور ثقافتی تناظرات کو مدنظر رکھتے ہوئے ظریفانہ شاعری میں اپنے عہد کی ترجمانی کی انھوں نے اپنے عہد کے سیاسی و سماجی حالات سے اپنی فکر کو جلا بخشتے ہوئے ان حالات کو اپنے تخیّل کی بلند پروازی سے شعر کے قالب میں ڈھالا، یوں ان کی شاعری ان کے عہد کی آئینہ دار بن کر ابھری۔

سیاسی وسماجی حوالے سے برصغیر کے حالات پر نظر ڈالی جائے تو بیسویں صدی کا نصف آخر برصغیر اور خاص طور پر پاکستان کے لیے خاصا ہنگامہ خیز عرصہ رہا ہے۔اس عرصے میں ایک طرف تو پچاس کی دہائی میں اس نوزائیدہ مملکت کو ان گنت مسائل کا سامنا تھا تو دوسری طرف سیاسی سطح پر انتشار کی کیفیت تھی ملک کا متفقہ آئین نہ ہونے کی وجہ سے انتظامی سطح پر ریاستی اداروں کو قانون سازی اور اس پر عمل درآمد کے حوالے سے بھی مشکلات کا سامنا تھا۔سیاسی سطح پر افراتفری کا ماحول اور مقتدر طبقے کی ریشہ دوانیوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔

سیاسی انتشار کا اثر سماجی سطح پر بھی پڑا۔پاکستانی سماج میں شروع ہی سے مختلف عناصر سرگرم رہے جن کا مقصد اس مملکت کے استحکام کے بجائے اپنی خواہشات کی تکمیل اور اپنی ذات کو مستحکم کرنا تھا۔ایسے عناصر کی ذاتی خواہشات کی وجہ سے سماج میں بہت سے منفی رویے پروان چڑھنے لگے اس کے ساتھ ساتھ ملکی امور کی انجام دہی میں فوج کی مداخلت نے بھی سیاست اور سماج کو خاص طور پر متاثر کیا جس کے نتیجے میں ایک ایسے ملک کا خواب اپنی تعبیر نہ پا سکا جو حقوق اور اصولوں کے حوالے سے سب کے لیے یکساں ہو۔سماج کے ساتھ ساتھ ان سیاسی حالات نے ادب کو بھی متاثر کیا۔ان حالات میں ملک میں جو ادبی منظر نامہ تشکیل پا رہا تھا اس میں ان سیاسی اور سماجی حالات کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔

طنز ومزاح منفی سرگرمیوں اور منفی رویوں کو زیادہ موضوع بناتا ہے۔وہ سماج میں پائے جانے والی ناہمواریوں اور منفی رویوں کو ایسے لطیف انداز میں بیان کرتا ہے کہ حقیقت تک رسائی ہو جاتی ہے۔بیسویں صدی کے نصف آخر میں جو مزاح نگار سامنے آتے ہیں ان میں عنایت علی خاں کا نام خاص اہمیت کا حامل ہے۔ان کی ظریفانہ شاعری میں بیسویں صدی کی آخری دہائیوں کے پاکستان کے سیاسی اور سماجی حالات کو موضوع بنایا گیا ہے۔انھوں نے یوں تو مختلف جہات میں ادبی خدمات سرانجام دی ہیں لیکن ظریفانہ شاعری کے میدان میں ان کی خدمات خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ان کی ظریفانہ شاعری میں فکری اور موضوعاتی حوالے سے خاصا تنوع پایا جاتا ہے۔ پروفیسر عنایت علی خاں حساس ذہن کے مالک تھے،ملک کے سیاسی حالات پر ان کی گہری نظر تھی۔وہ سیاسی وابستگیوں سے بالاتر ہو کر سوچنے اور بیان کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔سیاست اور ادب کا آپس میں گہرا تعلق ہوتا ہے،کوئی بھی ادیب اپنے عہد کے سیاسی وسماجی منظر نامے کو نظر انداز نہیں کر سکتا اور نہ ہی اس سے متاثر ہوئے بغیر رہ سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں بھی سیاسی چال بازیوں اور سیاسی منافقتوں پر خوب نشتر ملتے ہیں۔

پروفیسر عنایت علی خاں کی ظریفانہ شاعری میں سیاسی موضوعات کا مطالعہ کیا جائے تو ان کے نزدیک سیاسی افراتفری اور سیاسی انتشار کا بڑا سبب خود سیاست دان ہیں۔ان کے نزدیک ملکی حالات میں بھی انھی سیاست دانوں کی نالائقی اور کم ظرفی کا عمل دخل ہوتا ہے۔پاکستان میں بار بار سیاسی بساط کو الٹ کر مارشل لا کی صورت میں ملک پر جو آمریت مسلط کی جاتی ہے پروفیسر عنایت علی خان اس کا ذمہ دار سیاست کو ٹھہراتے ہیں:

سیاسی کم نگاہی رنگ لائی
ہمیں پھر مارشل لا ہو گیا نا! (۱)

مارشل لا کی صورت میں جو آمریت مسلط کی جاتی ہے پاکستان میں اس کی تاریخ دیکھیں تو ہر فوجی آمر نے اپنے ابتدائی

خطاب میں اپنے اس غیر آئینی اقدام کو ملک وقوم کی بہتری کے لیے لازم قرار دیا۔ پاکستان میں اب تک مارشل لا کل عرصہ ۳۲ سال سے کچھ زیادہ بنتا ہے۔ اس عرصے میں جنرل ایوب خان ۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۹ء، جنرل یحییٰ خان ۱۹۶۹ء تا ۱۹۷۱ء، جنرل ضیاء الحق ۱۹۷۷ء تا ۱۹۸۸ء اور جنرل پرویز مشرف ۱۹۹۹ء تا ۲۰۰۸ء ملکی آئین کو پامال کر کے ملک کے اقتدار پر قابض رہے (۲)۔ یہ بتیس سال سے زیادہ عرصہ قوم کی بہتری اور حالات کو بہتر بنانے کی آڑ میں گزارا گیا جب کہ ہر آنے والے مارشل لا منتظم نے قوم سے یہ وعدہ کیا تھا کہ فوج بہت جلد جمہوریت کو بحال کر کے اقتدار سے الگ ہو جائے گی۔ ملک میں جنرل ضیاء الحق نے منتخب وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت معزول کر کے جو آمریت نافذ کی وہ تاریخ کی بدترین آمریت قرار دی جا سکتی ہے۔ جس میں آمریت کو اسلام کی چھتری فراہم کی گئی اور اسلام کا نام لے کر اپنے اقتدار کو طول دینے کی کوشش کی گئی۔ جنرل ضیاء الحق نے جو آمریت نافذ کی اس پر اس وقت کے سماجی اور ادبی حلقوں میں بہت بحثیں بھی ہوئیں۔ جب یہ بحثیں صاحبانِ اقتدار تک پہنچای شروع ہوئیں تو زبان و بیان پر بھی پابندیاں لگائی جانے لگیں۔ جنرل ضیاء الحق نے اپنے اس غیر آئینی اقدام کو ملک وقوم کی بہتری کے لیے لازم قرار دیا اور ساتھ یہ وعدہ بھی کیا کہ فوج اسی سال انتخابات کروا کے اقتدار سے الگ ہو جائے گی۔ مارشل لا نافذ کرنے کے بعد قوم کے نام اپنے خطاب میں انھوں نے واشگاف انداز میں یہ اعلان کیا تھا کہ:

> ''نہ میرے کوئی سیاسی عزائم ہیں نہ ہی فوج اپنے سپاہیانہ پیشے سے اکھڑنا چاہتی ہے۔ مجھے صرف اس خلا کو پر کرنے کے لیے آنا پڑا ہے جو سیاست دانوں نے پیدا کیا ہے اور میں نے یہ چیلنج صرف اسلام کے ایک سپاہی کی حیثیت سے قبول کیا ہے۔ میرا واحد مقصد آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کروانا ہے۔ جو اس سال اکتوبر میں منعقد ہوں گے اور انتخابات مکمل ہوتے ہی میں اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کو سونپ دوں گا اور میں اس لائحہ عمل سے ہرگز انحراف نہیں کروں گا۔''(۳)

قوم کے لیے ان کا یہ خطاب سیاسی معاملات کو سلجھانے کے حوالے سے خاصا تسلی بخش تھا لیکن سنجیدہ حلقے یہ بھی جانتے تھے کہ پچھلے دو مارشل لاؤں کے تجربے نے یہ ثابت کیا ہے کہ فوج اقتدار میں آ جائے تو آسانی سے واپس نہیں جاتی اس حوالے سے اس دور کے ادب میں بھی بہت کچھ لکھا گیا۔ عنایت علی خان کی ظریفانہ شاعری میں بھی آمریت ایک اہم موضوع بن کر ابھری۔ وہ حالات پر گہری نظر رکھنے اور لوگوں کی نفسیات کو جاننے والے شخص ہیں۔ انھیں اس بات کا یقین تھا کہ مارشل لا کے نفاذ کے بعد نوے دنوں میں یا کچھ عرصے میں جمہوریت کی بحالی کی امیدیں خام خیالی کے سوا کچھ نہیں کیونکہ فوج نے جب اتنا بڑا اقدم اٹھایا ہے تو اتنی جلدی اقتدار سے الگ نہیں ہو گی اس حقیقت کو وہ شاعری میں یوں بیان کرتے ہیں:

وہ شہسوار ہی کیا جو زمیں پہ آ جائے
اماں وہ شعبدے دکھلا رہا ہے، کیا سمجھے؟(۴)

اور پھر تاریخ نے دیکھا کہ ضیاء الحق کی زندگی کی آخری سانس تک اس کے یہ سب اعلانات شعبدے ہی ثابت ہوئے اور وہ جیتے جی اقتدار سے الگ نہ ہوا۔ عنایت علی خان نے نہ صرف آمریت کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا بلکہ سیاست

دانوں کو بھی خوب رگیدا ہے۔ ان کی ظریفانہ شاعری کے موضوعات کا سیاسی تناظر میں جائزہ لیا جائے ان کے اکثر موضوعات سیاست دانوں کی کم ظرفی ،خود پسندی، لالچ ،دھونس، دھاندلی اور منافقت کا احاطہ کرتے نظر آتے ہیں۔گزشتہ کئی دہائیوں سے ملکی سیاست میں یہ غلط رواج چل نکلا ہے کہ سیاست دان اور خاص طور پر صاحبانِ اقتدار، اقتدار کے ایوانوں میں آنے سے قبل قوم سے بڑے بڑے وعدے کرتے اوران کے غم میں غلطاں نظر آتے ہیں،لیکن اقتدار میں آتے ہی عوام نام کے لفظ سے بھی ناواقف ہوجاتے ہیں وہ اقتدار کے مزے لوٹتے ہیں اور جب ملک وقوم پر کسی طرح کی مصیبت اور آفت نازل ہوتی ہے تو عوام کو اس کے حال پر چھوڑ کر خود بیرون ملک فرار ہوجاتے ہیں۔ پروفیسر عنایت علی خان نے اس منفی رویے کو بھی طنز کا نشانہ بنایا ہے:

ایک ورکر نے کہا چپکے سے میرے کان میں
قوم ہے مشکل میں اور مشکل کشا انگلینڈ میں
یار یہ انگلینڈ ہے یا سب کی خالہ جی کا گھر
گھر سے جوروٹھا وہ جا کر پڑ گیا انگلینڈ میں
ملک ہے یا رہنماؤں کی ہے اپنے لانڈری
جاکے دھوآتے ہیں ہر جرم و خطا انگلینڈ میں
واپس آتے وقت اک عمرہ بھی کرتے آئیں گے
ہے خدا مکے میں لیکن نا خدا انگلینڈ میں (۵)

پروفیسر عنایت علی خان کا سیاسی شعور خاصا پختہ تھا وہ ایک پڑھے لکھے شخص تھے اور سرکاری ملازمت میں بھی رہے۔سماج کے ایک متحرک فرد تھے۔انھوں نے اپنی شاعری میں سیاست اور سماج میں پروان چڑھنے والے منفی رویوں کو خاص طور پر طنز کا نشانہ بنایا ہے۔سیاست دانوں میں ذاتی مفادات کے حصول کی دوڑ نے ان کے ضمیر کو مردہ کردیا ہے۔ان کا مطمع نظر صرف اور صرف اپنی خواہشات کی تکمیل بن کر رہ گیا ہے۔اس مقصد کے حصول کے لیے وہ، ہر وہ حربہ استعمال کرتے ہیں جو انھیں اقتدار کے ایوانوں تک پہنچا دے۔دھونس، دھاندلی کے ساتھ ساتھ پارٹیاں بدلنے کی روش نے ملکی سیاست کو اپنی اصل سمت سے ہٹا دیا ہے۔سیاست دانوں کی اکثریت اپنے مفادات کے لیے ہر اس پارٹی میں شامل ہو جاتی ہے جسے اقتدار ملنے کی امید ہوتی ہے۔اکثر اوقات تو یہ صورت حال اس قدر مضحکہ خیز بھی بن جاتی ہے۔ایک امیدوار اپنی انتخابی مہم میں جس پارٹی کو ملک وقوم کے لیے خطرناک قرار دیتا ہے اور اقتدار میں آنے سے روکنے کے جتن کرتا ہے اگر انتخابات کے بعد وہ پارٹی اقتدار میں آجاتی ہے تو یہ امیدوار سب کچھ بھول کر اسی میں شامل ہوجاتا ہے۔اسے نہ عوام کے جذبات کا احساس ہوتا ہے نہ ان کے مسائل سے کوئی غرض ہوتی ہے۔اس کے سامنے صرف اپنے سیاسی اور معاشی مفادات ہوتے ہیں جن کی خاطر وہ اپنے ضمیر کو پسِ پشت ڈال کر منافقت کا رویہ اختیار کرتے ہوئے پارٹی بدل لیتا ہے۔ پروفیسر عنایت علی خان نے اس سیاسی منافقت کو بھی نمایاں کیا ہے۔ان کے خیال میں ایسے لوگ نہ تو ملک کے خیر خواہ ہوتے ہیں اور نہ ہی ملک وقوم کی فلاح کا کوئی ایجنڈا ان کے پاس ہوتا ہے۔اس حقیقت کو وہ یوں بیان کرتے ہیں:

کوئی منشور ہے ان کا نہ کوئی پالسی ان کی
نہ ان کی پیروی میں دیکھنا ہم بھی بھٹک جائیں
مفادِ قوم سے نا آشنا، کردار سے عاری
یہ بے پیندی کے لوٹے ہیں جدھر چاہیں لڑھک جائیں(۶)

ہر بار نئے وعدے اور نئے عزم ان کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں لیکن بات وہی ''ڈھاک کے تین پات'' سے آگے نہیں بڑھتی۔ ان ضمیر فروش سیاست دانوں کی اپنی تجوریاں بھرتی چلی جاتی ہیں جب کہ عوام کی حالت سقیم ہوتی جاتی ہے۔ سیاست دان انتخابات سے قبل جن وعدوں سے عوام کو بے وقوف بنانے کی کوشش کرتے ہیں اس کی ایک جھلک ملاحظہ ہو:

مرا منشور ہے بس خدمتِ قوم
مرا مقصود ہے بس عظمتِ قوم
مجھے پیاری ہے بے حد عزتِ قوم
رُلاتی ہے مجھے یہ ذلّتِ قوم
مجھے اک بار پھر تم ووٹ دے دو!
اگر میں اس دفعہ پھر جیت جاؤں
کروں گا کیا تمھیں کیا کیا بتاؤں
خوشی سے تم کہیں پاگل نہ ہو جاؤ
میں اپنے خواب کیا تم کو سناؤں
مجھے اک بار پھر تم ووٹ دے دو!
نہ ہو گا ملک میں پھر کوئی کنگلا
ہر اک کنگلے کو دوں گا ایک بنگلہ
عدالت سے میں ہٹوا دوں گا جنگلہ
ہر اک نالے کو بنوا دوں کا منگلہ
مجھے اک بار پھر تم ووٹ دے دو!(۷)

سیاست دان عوام کو سبز باغ دکھاتے ہوئے اُن کا مستقبل روشن کرنے اور خوشحالی لانے کے وعدے یوں کرتے ہیں:

نہ کوئی بعد ازاں فاقے کرے گا
چکن کھا کر مرے گا جو مرے گا
جو گھنٹہ بھر کو مزدوری کرے گا

زر و گوہر سے اس کا گھر بھرے گا
بس اب پرسوں الیکشن ہو رہا ہے
دلدّر دور ہو جائیں گے پیارے!
ترقی پاؤں چومے کی تمہارے!
ہر اک ووٹر کے ہوں گے وارے نیارے!
جو بل ہیں، نوٹ بن جائیں گے سارے!
بس اب پرسوں الیکشن ہو رہا ہے
بھلا اب میں کوئی جھوٹا ہوں یارو!
لبِ بام آکے یوں ہمت نہ ہارو
گزارے ہیں جہاں پر ساٹھ اک سال
یہ اڑتالیس گھنٹے اور گزارو
بس اب پر سوں الیکشن ہو رہا ہے(۸)

اورعوام ان کی باتوں میں آ کر ایک بار پھر ان کو ووٹ دے دیتے ہیں۔ووٹ ملنے اور اقتدار میں پہنچنے کے بعد آئندہ انتخابات تک عوام اور ان کے درمیان خلیج کی خوب عکاسی کی ہے۔پروفیسر عنایت علی خان کی ظریفانہ شاعری میں ان تمام سیاسی حالات کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔اس کی بڑی وجہ وہ حالات ہیں جن میں عنایت علی خان کی شاعری پروان چڑھی انھوں نے جن حالات کا مشاہدہ کیا۔انھیں سچائی کے ساتھ شعر کے قالب میں ڈھالا۔ان حالات اور منفی سماجی رویوں کی اصلاح کی ہر ممکن کوشش کی۔یہ سچائی ہی ان کی شاعری کا بنیادی وصف قرار پاتی ہے۔وہ اس سچائی کے اظہار کے لیے طنز کے نشتر بھی چلاتے ہیں اور ظرافت کی مٹھاس بھی بانٹتے ہیں ان کے ہاں اس کشمکش کا ذکر کرتے ہوئے سید ضمیر جعفری لکھتے ہیں:

> ''طنز،مٹھاس اور تلخی بلکہ یوں کہیے کہ سرجن اور قصاب میں ہاتھا پائی ہمیشہ جاری رہتی ہے پروفیسر عنایت علی خان کے یہاں یہ کشمکش خصوصیت کے ساتھ موجود ہے۔اور اس میں بھی کبھی سرجن کا کردار دب جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ اپنی شاعری میں رہنا چاہتا ہے اور ایک سچا انسان بھی رہنا چاہتا ہے اور میرے نزدیک ان کی سب سے بڑی انفرادیت بھی ہے اور یہی ان کا سب سے بڑا المیہ بھی ہے۔''(۹)

پروفیسر عنایت علی خان نے شاعری میں مختلف انداز اختیار کیے ہیں۔ایک طرف ان کے ہاں موضوعات کا خاصا تنوع ملتا ہے تو دوسری طرف ان موضوعات کو بیان کرنے کے حوالے سے اسلوب کی سطح پر بھی انھوں نے مختلف انداز اختیار کیے ہیں۔ظریفانہ شاعری میں علامتی انداز اختیار کرنا خاصا دقیق کام ہے۔سماجی ناہمواریوں کو علامتی انداز میں بیان

کرنے سے عام قارئین اصل حقیقت تک رسائی حاصل کرنے میں مشکل کا شکار رہتے ہیں اس لیے ظریف شاعر کو علامت استعمال کرتے وقت خاص مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ عنایت علی خان نے علامتی انداز اس طرح اختیار کیا ہے کہ حقیقت قاری سے چھپ نہیں سکتی۔ اس حوالے سے یہاں ایک مثال پیش کی جاتی ہے کہ ضیاء الحق کے بعد جب بے نظیر اقتدار میں آئی اور جمہوریت بحال ہوئی تو طویل عرصے سے پامال آئین کو بھی سنبھالا دینے کی کوشش کی جانے لگی۔ جنرل ضیاء الحق نے صدارت سنبھالنے کے بعد بہت سے اختیارات بطورِ صدر استعمال کرنا شروع کر دیے۔ بے نظیر بھٹو کے حکومت میں آنے سے قبل آئین میں آٹھویں ترمیم کی گئی۔ منتخب حکومت کو اسمبلیاں توڑ کر چلتا کرنے کا اختیار صدر کے پاس ہونے سے بے نظیر کو ہر وقت حکومت کے ختم ہو جانے کا دھڑکا بھی لگا رہتا تھا اس خوف سے نجات کی ایک ہی صورت تھی کہ صدر کے سنگھاسن پر ایسے شخص کو بٹھایا جائے جو ان کی ہاں میں ہاں ملانے والا ہو۔ ایسے میں نظرِ انتخاب فاروق خان لغاری پر پڑی۔ فاروق خان لغاری ابتدا میں تو بے نظیر بھٹو کے لیے بالکل بے ضرر ثابت ہوئے پروفیسر عنایت علی خان نے صدر کے بااختیار ہونے کے باوجود بے اختیار رہنے کو یوں بیان کیا ہے:

سنو رے لوگو! نئی کہانی
ایک ہے راجا ایک ہے رانی
راج پاٹ سب راجا کا ہے
رانی ہے بس نام کی رانی
پل پل اس سے پوچھ رہی ہے
بول مری مچھلی کتنا پانی؟
بول مری مچھلی کتنا پانی؟
پرجا بولی پیاری رانی
دیس میں ہوگئی سخت گرانی
مہنگائی نے گاڑے جھنڈے
شور کرو تو کھاؤ ڈنڈے
ہوگئے سب کے چولہے ٹھنڈے
کس برتے پر تتّا پانی
بول مری مچھلی کتنا پانی؟
بول مری مچھلی کتنا پانی؟
رانی نے اک توتا پالا
رنگت جس کی دھانی دھانی

یہ توتا گر چونچ ہلائے
راج پاٹ چوپٹ ہو جائے
بیٹھا سر نہوڑائے ہوئے ہے
گونگے کا گڑ کھائے ہوئے ہے
بولے تو وہ کیسے بولے
کیسے اپنی چونچ وہ کھولے
اس کو بھی ہے پریت نبھانی
اس کو بھی ہے چوری کھانی
بول مری مچھلی کتنا پانی؟
بول مری مچھلی کتنا پانی؟
رانی کا اک نوکر بھی ہے
وردی ہے جانی پہچانی
کہنے کو جی دار بڑا ہے
رن میں جا کر خوب لڑا ہے
پر وہ بھی چپ چاپ کھڑا ہے
نیل گگن کو دیکھ رہا ہے
ان انکل کی مرضی کیا ہے؟
رہنی ہے رانی یا جانی
بول مری مچھلی کتنا پانی؟
بول مری مچھلی کتنا پانی؟(۱۰)

یہاں ''رانی''، بے نظیر بھٹو کے لیے اور ''توتا'' کی علامت صدر فاروق لغاری کے لیے استعمال کی گئی ہے۔ جب کہ توتے کی چونچ، جس کے ہلانے سے راج پاٹ کے چوپٹ ہو جانے کا ذکر ہے وہ آٹھویں ترمیم ہے جس کے تحت اسمبلیاں برطرف کرنے کا اختیار صدر کے پاس ہوتا ہے۔ اس عہد میں بے نظیر کی من مرضیوں اور مشیروں کے غلط مشوروں کی وجہ سے ملکی حالات سیاسی اور اقتصادی حوالے سے خراب ہوتے جا رہے تھے۔ عوام کی اکثریت اس وقت کی حکومت سے تنگ آ چکی تھی اور یہ خواہش پیدا ہو رہی تھی کہ کس طرح اس حکومت کا خاتمہ ہو جائے اور فلاحی حکومت قائم ہو۔ حکومت کے خاتمے کا اختیار صدر کے پاس تھا جو توتے کی طرح صاحبانِ اقتدار کی ہاں میں ہاں ملانے والے تھے لیکن جب حالات انتہائی دگرگوں ہو گئے تو صدر فاروق لغاری نے اسمبلیاں برطرف کر کے حکومت کو چلتا کر دیا۔

سیاسی ابتری اور منفی سیاسی رویوں کی عکاسی کے ساتھ ساتھ سماجی حوالے سے پروفیسر عنایت علی خان کی شاعری کا فکری و موضوعاتی مطالعہ کیا جائے تو ان کی ظریفانہ شاعری میں سماجی موضوعات بھی ملتے ہیں۔ان کے ہاں موضوعاتی حوالے سے خاصا تنوع ملتا ہے۔وہ موضوعات گھڑتے نہیں بلکہ موضوعات ان کے حساس ذہن میں جنم لے کر ان کے قلم سے قرطاس پر منتقل ہوتے ہیں۔ان کی شاعری میں اپنے عہد کے سماج کا نقشہ ابھرتا دکھائی دیتا ہے۔انھوں نے سماجی ناہمواریوں کو خاص طور پر طنز کا نشانہ بنایا ہے۔وہ معاشرے کے خراب حالات اور اس میں پائی جانے والی بے راہ رویوں پر کڑھتے ہیں اور ان بے راہ رویوں کی وجہ سے معاشرے کو زوال کی کھائی میں گرتا دیکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے مزاح میں سماجی تلخی پائی جاتی ہے۔امجد اسلام امجد لکھتے ہیں:

''ان کا مزاح صرف ایک پردہ ہے جس کے پیچھے اقدار کا آشوب اور معاشرے کے زوال کے آشوب کا بہت تلخ لیکن حقیقت پسندانہ تجزیہ سطر سطر میں جھلکتا نظر آتا ہے۔''(۱۱)

سماج میں خوشامد اور لالچ نے بہت سے سماجی برائیوں کو پروان چڑھایا ہے۔خوشامد کے ذریعے لوگ دوسروں کو شیشے میں اتار کر اپنا الو سیدھا کرتے ہیں، اپنے کام نکلواتے ہیں اور پھر سب کچھ بھول کر کسی دوسرے کام کے لیے کسی دوسرے کی خوشامد میں لگ جاتے ہیں۔یہ خوشامدی لوگ سماج کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکا ہوتے ہیں ان کا مقصود صرف اپنے کام نکلوانا ہوتا ہے۔پروفیسر عنایت علی خان نے ایسے خوشامدی لوگوں کو بھی گہرے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ان کی شاعری میں خوشامد اور خوشامدی لوگوں کو خاص طور پر موضوع بنایا گیا ہے۔اس حوالے سے ان کی نظم ''مکھن لگاؤ بھیا'' خاص اہمیت کی حامل ہے۔اس نظم میں انھوں نے خوشامدی لوگوں کے طریقہ واردات کو بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔اس کی عکاسی کے لیے اس نظم کے چند بند ملاحظہ ہو:

جو کام ہو نہ پائے وہ لاکلام ہوگا
اعلیٰ سے اعلیٰ افسر ادنیٰ غلام ہوگا
کیسا ہی سنگ دل ہو مکھن سے رام ہوگا
بالائے بام طائر یوں زیرِ دام ہوگا
مکھن لگاؤ بھیّا! مکھن سے کام ہوگا
ما تحت افسروں کو مکھن لگا رہے ہیں
مکھن لگا لگا کر الو بنا رہے ہیں
تعریف کر رہے ہیں پانی چڑھا رہے ہیں
افسر پھسل پھسل کر شیشے میں آ رہے ہیں
مکھن لگاؤ بھیّا! مکھن سے کام ہوگا
مکھن سے مل رہا ہے کتنوں کو آب و دانہ
بلبل کے گھونسلے میں اُلّو کا ہے ٹھکانہ

''تنویر'' بن گئی ہے کل تک جو تھی ''شبانہ''
مکھن سے چل رہا ہے دنیا کا کارخانہ
مکھن لگاؤ بھیّا! مکھن سے کام ہوگا(۱۲)

پروفیسر عنایت علی خان چوں کہ خود سرکاری عہدے پر فائز تھے اور لوگوں کو ان سے کام بھی پڑتے تھے اس مقصد کے لیے خوشامد کرنے والے بھی بہت تھے یوں انھیں ایسے کاموں کا ذاتی تجربہ تھا کہ لوگ کیسے خوشامد کے ذریعے دوسروں کو بہلاتے پھسلاتے اور اپنے کام نکلواتے ہیں۔

مہنگائی سماج کا ایسا المیہ ہے جسے ہر دور کے ہر ظریف شعرا نے موضوعِ سخن بنایا ہے۔ جب اشیائے ضروریہ انسانی پہنچ سے دور ہو جائیں اور اس پر مستزاد یہ کہ سماج میں طبقاتی تفریق بھی بڑھتی چلی جائے تو سماجی کشمکش جنم لیتی ہے۔ یہ کشمکش ہیجان میں بھی بدل جاتی ہے آئے روز کی گرانی انسان کی بہت سی خواہشوں کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔ سرکاری ملازم تو ویسے بھی بندھی ٹکی ماہانہ تنخواہ پر ہوتا ہے، اگر مہنگائی کے تناسب سے تنخواہ میں اضافہ نہ ہو (جو کبھی نہیں ہوا) تو مسائل جنم لیتے ہیں۔ دوسری طرف پاکستان میں مختلف تہواروں پر گراں فروشی ویسے بھی عروج پر نظر آتی ہے۔ ایسے میں بازار جانے کے بعد عام آدمی کی جو حالت ہوتی ہے، عنایت علی خان اسے یوں بیان کرتے ہیں:

رات بازار ہو کے آئے ہیں
گویا بیزار ہو کے آئے ہیں
واں خریدار بن کے پہنچے تھے
مفت میں خوار ہو کے آئے ہیں
جو بھی سر پر پڑا ہے جھیلیں گے
پھر وہی عید عید کھیلیں گے(۱۳)

ان کے ہاں قومیت اور وطنیت کے تصورات بھی شعری قالب میں ڈھل کر ظریفانہ شان پیدا کرتے ہیں۔ وہ قومیت کے جذبے سے سرشار ہو کر دشمن کو جواب دینے اور دشمن کے مقابلے میں اپنی اور قوم کی برتری ثابت کرنے میں خاص مہارت رکھتے ہیں۔ ہندوستان کے جوہری توانائی کے حصول کا مظاہرہ کرنے کے لیے دو مراحل میں دو اور تین ایٹمی دھماکے کر کے خود کو جوہری قوت کے طور پر پیش کیا جب کہ پاکستان نے اسی مہینے میں اکٹھے پانچ ایٹمی دھماکے کر کے نہ صرف بھارت کو بھرپور جواب دیا بل کہ تمام تر عالمی خطرات، دباؤ اور پابندیوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے خود کو جوہری طاقت کے حامل ملک کے طور پر منوا لیا دو اور تین کے مقابلے میں اکٹھے پانچ دھماکوں کو عنایت علی خان نے بڑے لطیف انداز میں بیان کیا ہے:

چاغی میں جو ہم نے مارا وہ نہلے پہ دہلا تھا
سنتے ہو مہراج دھماکہ اس کو کہتے ہیں
دو اور تین الگ ہوں تو یہ بات کہاں ہے لالہ جی

پانچوں ہوں ایک ساتھ طمانچہ اس کو کہتے ہیں (۱۴)

مجموعی طور پر پروفیسر عنایت علی خان کی ظریفانہ شاعری میں فکری اور موضوعاتی سطح پر خاصا تنوع ملتا ہے۔ انھوں نے ظریفانہ نظم اور غزل دونوں میں اپنے عہد کی سیاست اور سماج میں پائی جانے والی ناہمواریوں کو لطیف طنز کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کے موضوعات نہ صرف علاقائی اور قومی سطح کے ہیں بل کہ عالمی سیاست اور عالمی سماجی منظر نامے پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ عالمی سیاسی و سماجی منظر نامے کے بیان میں ان کی ظریفانہ شاعری کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اپنے منفرد اور رواں اسلوب بیان، موضوعاتی تنوع اور فکری بالیدگی کی بنا پر عنایت علی خان کا شمار ظریفانہ شاعری کے اہم نمائندوں میں کیا جاتا ہے۔

## حوالہ جات


۱۔ عنایت علی خان،کلیات عنایت،(کراچی: سردار سنز،۲۰۱۳ء)ص۲۳۹

۲۔ سید جعفر احمد، پاکستان میں فوجی استبداد کی تاریخی بنادیں،مشمولہ:پاکستان میں مارشل لاکی تاریخ،(لاہور:فکشن ہاؤس،۲۰۱۷ء)،مرتبہ: مبارک علی،ص ۷

۳۔ ضیاء الحق،بحوالہ: پاکستان میں مارشل لا کی تاریخ،مرتبہ:مبارک علی،ص۲۶۰

۴۔ عنایت علی خان،کلیات عنایت،ص۲۴۶

۵۔ ایضاً،ص۲۵۹

۶۔ ایضاص۲۸۳

۷۔ ایضاً،ص۱۷۳

۸۔ ایضاً،ص۱۷۲

۹۔ ضمیر جعفری،عنایت علی خان،مشمولہ: سہ ماہی بیلاگ،(کراچی: جولائی تا ستمبر۲۰۰۶ء)،شمارہ۳،ص۱۲۵

۱۰۔ عنایت علی خان،کلیات عنایت،ص۴۲۸

۱۱۔ امجد اسلام امجد،مزاح کا پردہ،مشمولہ: سہ ماہی، بیلاگ،ص۱۳۷

۲۱۔ عنایت علی خان، کلیات عنایت،ص۱۷۰

۱۳۔ ایضاً،ص۴۱۲

۱۴۔ ایضاص۴۸۷